باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یومِ پاکستان ۱۹۸۱ء

اسلامی نظامِ حکومت:

نہ مغربی جمہوریت، نہ شخصی حکومت

(پرویز صاحب کا ایک اہم بصیرت افروز مقالہ)

بتقریب یومِ پاکستان ۱۹۸۱ء

نہ مغربی جمہوریت — نہ شخصی حکومت

(قرآن کا فیصلہ)

پرویز

کاروانِ انسانیت کی تاریخ، ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ انسان ایک نظریہ وضع کرتا ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز صعوبتوں۔ لرزہ انگیز خوں ریزیوں اور وحشت ناک فساد انگیزیوں۔ مہیب لڑائیوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد یہ حقیقت اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس کے بعد وہ اس کی جگہ ایک اور نظریہ وضع کرتا ہے، جو بالعموم سابقہ نظریہ کی ضد ہوتا ہے، اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی، اُسی قسم کے فساد انگیز مراحل سے گذر کر ناکام ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک اسی قسم کے عمل اور ردِ عمل (ACTION AND RE-ACTION) تجارب سے گذر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کا تعلق اس کی زندگی کے ہر گوشے ——— معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سے ہے۔ آج کی نشست میں ہم صرف اس کے سیاسی پہلو، اور وہ بھی اس کے ذیلی شعبے، اسلوبِ حکومت سے متعلق گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آج کس مقام پر کھڑا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہرحال، مِل جُل کر رہنا ہے۔ مِل جُل کر رہنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ افراد اور گروہوں کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ ان میں تنازع ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جن دو فریقوں میں باہمی تنازع ہو، وہ اسے از خود نہیں سلجھا سکتے۔ اس کے لئے کسی تیسرے فریق (ثالث) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے حکومت کا تصور پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے، انسان نے قبائلی زندگی اختیار کی جو خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا۔ اس اندازِ زندگی میں قبیلہ کا بزرگ،

قبائلی زندگی

یعنی مورثِ اعلیٰ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا اور اس کے فیصلے سب کے لئے واجب الاتباع تھے۔ یہ حکومت یا مملکت کا پہلا خاکہ تھا۔ اس میں عام طور پر مرد ہی سربراہ ہوتا تھا اگرچہ کہیں کہیں عورتیں بھی سربراہ نظر آتی ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں (اور ابتدائی کیا، اب بھی جہاں جہاں جہالت ہے وہاں) پروہتوں (PRIESTS)

کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان پروہتوں نے جب دیکھا کہ لوگ بزرگِ خاندان (یا قبیلہ) کو اس لئے سربراہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے، تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں کے دل میں جو ان کا (پروہتوں کا) احترام ہے، اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا (اور عوام سے منوا لیا) کہ درحقیقت حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ اس سے تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کے الوہیاتی اختیارات) کے نہج حکومت کی طرح پڑی۔

تھیاکریسی

کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی زور آور نے کسی طرح قوت فراہم کر لی اور اپنے ساتھ اسی قسم کے اور شاہزور افراد ملا لئے تو انہوں نے کمزور انسانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح حکومت بزورِ قوت" کا انداز وجود میں آیا۔ اسے ملوکیت یا شاہنشاہیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان اربابِ قوت (راجاؤں ۔۔۔ بادشاہوں) نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ خالی قوت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبائے رکھنے میں خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ قوت کے ساتھ احترام یا عقیدت کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے دیکھا کہ قوت کے بغیر خالی عقیدت کے زور پر اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس باہمی ضرورت کے تحت، بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں (راجاؤں اور پروہتوں) نے باہمی سمجھوتا کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے، راجہ کو ایشور کا اوتار اور سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے دیا اور بادشاہوں نے کہا کہ انہیں یہ خدائی اختیارات، مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے حاصل ہیں۔ عملی زندگی میں انہوں نے دوائرِ اقتدار بانٹ لئے۔

ملوکیت

مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی گئی اور دنیاوی معاملات میں، بادشاہوں کی۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔

سیکولرازم

اس مختصر سی روئداد سے ہم نے دیکھ لیا کہ انداز و اسالیبِ حکومت کتنے ہی کیوں نہ بدلتے رہے ہوں، نظریہ شروع سے اخیر تک ایک ہی کارفرما رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس نظریہ کے تابع، حکمرانوں کے ہاتھوں محکوم انسان جس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے اور جن مظالم کا تختۂ مشق بنے، ان کے تصور سے خود انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب یہ بہیمیت اور درندگی انتہا تک پہنچ گئی تو مغرب کے بعض مفکرین کے دل میں اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اندازِ حکومت کچھ ایسا ہونا چاہیئے جس میں انسان کی حکومت انسان پر نہ ہو۔ ان کی فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ نظامِ حکومت لوگوں کے باہمی معاہدہ سے قائم ہونا چاہیئے۔ اسے نظریۂ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مشہور مفکر ہابز اور لاک سے ہوئی تھی لیکن چونکہ اس کی عملی تفاصیل روسو (ROUSSEAU--1712-1778) نے مرتب کی تھیں اس لئے ہم اس سرگزشت کو وہیں سے شروع

نظریۂ میثاق

کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی آزادی برقرار رہے لیکن تمدنی زندگی میں یہ ناممکن ہو چکا ہے اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ تمام انسان مل کر اپنی اپنی انفرادیت کو اجتماعی معاشرہ میں جذب کر دیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے احکام کا اتباع ہر فرد کی اپنی ذات کا اتباع ہوگا اور کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوگا۔ اس اجتماعی معاشرہ کو روسو، اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہر فرد کے "دو ارادے" ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک بہ حیثیتِ شہری ہونے کے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایک فرد کے ان ارادوں میں ٹکراؤ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ذاتی ارادے کو اجتماعی ارادے کے تابع رکھنا ہی عین آزادی ہے۔

الفاظ کی حد تک تو یہ نظریہ بڑا خوش آئند بلکہ دلکش تھا لیکن اس کے بعد جب اس کی عملی تفسیر کا مسئلہ سامنے آیا تو اس میں دشواری پیدا ہوئی۔ مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اس "اجتماعی ارادے" کا تعین کس طرح کیا جائے؟ اس کے جواب میں روسو نے کہا کہ اس کے لئے ہر فرد معاشرہ کی رائے دریافت کی جائے۔ لیکن یہ کہنے کے بعد اسے خود ہی خیال آیا کہ ایک مملکت کے تمام افراد کی آراء کا معلوم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لئے اس نے لاک کے نظریہ کا سہارا لیا جس نے کہا تھا کہ حکومت، افراد کے نمائندگان پر مشتمل ہونی چاہیئے اور اگر ان نمائندوں میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روسو اور لاک کے نظریات کے اس امتزاج کو قبول کر لیا گیا اور اس کے مطابق اسلوبِ حکومت کو ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا ترجمہ جمہوریت کیا جاتا ہے۔

ڈیماکریسی

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ڈیماکریسی کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر قائم ہوتی ہے:۔

(۱) اس نظامِ حکومت میں حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔

(۲) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۳) کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریتِ رائے ہوتا ہے۔ اور

(۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افرادِ مملکت پر ان کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔

شخصی حکومتوں کے ڈسے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس نظریہ کو آیۂ رحمت سمجھا۔ اس کی شان میں مدح و ستائش کے قصائد نشید ہوئے۔ اس کے نفاذ پر مسرت اور شادمانی کے جشن منائے گئے۔ انسانیت نے سمجھ لیا کہ اس نے آزادی کے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا ہے۔ اس کا شہرہ مغرب تک ہی محدود نہ رہا۔ اطرافِ عالم میں اس پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے۔ دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جمہوریت۔ جمہوریت۔ جمہوریت کے نعروں سے کرۂ ارض گونج اٹھا۔ جس نے اس اندازِ حکومت کو اختیار نہ کیا، یا اس کی مخالفت کی اسے انسانیت کا دشمن قرار دیا گیا۔

(۰)

لیکن اس غلغلے اور طنطنے کی ہنوز صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اُسی مغرب سے اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں کہ یہ نظریہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اسے نافذ کیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ مسلط ہو گئی، اس فرق کے ساتھ کہ عہدِ جاہلیت میں حکمران بے نقاب سامنے آتے تھے۔

جمہوریّت کے خلاف

اب اس دورِ تہذیب میں وہ جمہوریت کا نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اور عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا۔ یہ تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اپنے آپ پر خود حکومت کرتے ہو۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (CRISIS OF CIVILISATION) کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے تہذیبِ مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کی تباہی کا بڑا سبب، اندازِ جمہوریت ہے۔ اس نے کہا تھا:-

اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصوّر کرنا، عملی ناممکنات سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقے پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا، افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت کو لامتناہی اختیارات کا حامل بنا دیتا ہے۔ (صفحہ ۶۸)

اس نظریہ کے متعلق کہ اکثریت جسے صحیح کہدے، وہ صحیح ہوتا ہے، پروفیسر مذکور لکھتا ہے:-

عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ بالضرور صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ (محض اس لئے کہ اتنے لوگوں نے اسے صحیح کہہ دیا ہے) صحیح نہیں ہو سکتی..... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی ہمیشہ صحیح ہوگا" ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ لیکن اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ صحیح وہی ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے، وہی صداقت ہے۔ (صفحہ ۷۶)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:-

اقتدارِ اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصوّر ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم صرف اس صورت میں سمجھ میں

آسکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرّہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے؟ "اقتدارِ اعلیٰ" سے مفہوم "اختیاراتِ مطلقہ" ہے۔ یعنی بلاحدود و قیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ بنابریں "اقتدارِ اعلیٰ" کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظرانداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اسی مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، اور اس کے بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں یا کسی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا یہ تصور صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ قانون کا سرچشمہ عوام کا منشا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔ (ص۵۸)

اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اس میں ایسے اصولی نکات پیش کیے گئے ہیں جن کی اہمیت اس وقت سامنے آئے گی جب ہم جمہوریت کا تجزیہ قرآنِ مجید کی روشنی میں کریں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C EWING) نے اپنی کتاب (INDIVIDUAL-THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح وبسط سے بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران وہ لکھتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ جمہوری نظام میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ اپنے اوپر استبداد، یا خود اپنے حقوق کا غصب کبھی روا نہ رکھیں گے۔ لیکن

اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی اس خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص۱۱۶)

پروفیسر جوڈ (C.M JOAD) کو بھی، جو پہلے نظامِ جمہوری کا بڑا حامی تھا، بعد میں یہ کہنا پڑا کہ سائنس (یعنی مادی نقطۂ نگاہ سے) ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے، کیفیت (QUALITY) کی رُو سے نہیں۔ سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری اندازِ حکومت میں فیصلے "سروں کی گنتی" سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سر مفکر کا اور دوسرا گدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے:-

کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید (DECADENCE)

مشہور فرانسیسی مفکر (RENE GUENN) لکھتا ہے:-

فریبِ جمہوریت

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا

تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا مقتضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پیوست کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں..... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD -- P.106)

ڈین اِنگے (DEAN INGE) نے اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ڈیماکریسی کے خلاف، مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک اقتباس ہے:-

آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہوریتیں، مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی غلام۔ (MIRABEAU)

ایک اور:-

جمہوریت نظری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔ (IRVING BABBIT)

اور خود اِنگے کی اپنی رائے یہ ہے کہ

ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک یہ نظریہ جمہوریت اسے جمہوری بناتا ہے۔ (ص ۱۱۰)

۱۹۴۷ء میں، اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے منعقد کی تھی کہ وہ جمہوری نظامِ حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اس کا نام ہے۔ (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اصطلاح بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد کمیٹی نے دوسرا سوال پیش کیا کہ "کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟" اس کے جواب میں کہا گیا کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف اپیل کرے اور اسے بدلوا دے۔"

یہ ہیں جمہوریت کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین اور مدبرین کے خیالات۔ میں نے یہاں اختصار سے

کام لیا ہے جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں، وہ میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" میں "سیاست" کا باب ملاحظہ فرمالیں۔

(۰)

اقتدارِ اعلیٰ

سوال یہ ہے کہ جمہوریت کو مسترد کرنے کے بعد، یہ مفکرین کس قسم کا نظام چاہتے ہیں؟ اس باب میں بنیادی اور متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ، انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے یکسر خلاف ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مفکر (BERTAND DE JOUVENEL) نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (SOVEREIGNTY) وہ اس میں لکھتا ہے:۔

بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ، ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۹۹)

حکومت قانون کی

ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں، قانون کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد ان کے ہاں بحث یہ چل رہی ہے کہ وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ اس حقیقت کو امریکی ماہرِ آئین ایڈورڈ کارون اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICRO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

حقیقی قانون مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے..... نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (صفحہ)

قانون کیسا ہو؟

مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور بھی وضاحت سے لکھتا ہے:۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان (ملوکیت۔ آمریت)

یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مطلق اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیا جائے، خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا..... یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (QUOTED BY GRIFFITH - IN - INTERPRETATERS OF MAN - PP 46-47)

اس قانون کو ابدی اور غیر متبدل کہنے کے ساتھ ہی ان مفکرین نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پابجولاں یا محبوس ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ قوانین و اصول تو بے شک غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق (جنہیں وہ قانون کی تعبیرات کہہ کر پکارتے ہیں) حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ وائٹ ہیڈ (جس کا انتقال کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے، ہمارے زمانے کا بہت بڑا مفکر تھا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں محبوس رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوں گے لیکن ان اصولوں کی تعبیرات حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD - PP. 218-19)

آپ ان اقتباسات سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ انہیں نگاہ میں رکھئے کیونکہ جب آگے چل کر قرآنی تجزیہ آپ کے سامنے آئے گا تو اس وقت ان کی اہمیت واضح ہو گی۔

ممتاز مغربی مفکر (ERNEST BARKER) میزینی کی ہم نوائی میں کہتا ہے:-

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاشعاری کو عدمِ وفاشعاری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے، بادلِ نخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کروں۔ (ص ۱۹۵)

مملکت کی اطاعت

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے اس کی اطاعت ہم پر بہرحال واجب

ہو۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے اربابِ اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کسی بلند تقاضے کے ساتھ نہ ٹکرائے۔

PRINCIPLES OF SOCIAL & POLITICAL THEORY — P.P. 193; 195; 220.

یہاں آپ نے دیکھا کہ ان مفکرین کے نزدیک حقِ حکومت نہ فرد کو حاصل ہے نہ اکثریت کو۔ حکمرانی صرف اقدار کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ ان اقدار میں عدل کا تقاضا سرِ فہرست ہے۔ مغربی جمہوریت کی رُو سے، اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ مملکت کے رائج الوقت قانون کے مطابق کر دیا جائے، تو اسے مطابقِ عدل کہا جائے گا۔ لیکن اب یہ مفکرین کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ قانون کس قسم کا ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ قانون انسانوں کا وضع کردہ ہے تو اس کی رُو سے فیصلہ مبنی بر عدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عدل کا مفہوم

(EMIL BRUNNER) ہمارے دور کا فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:۔

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق اور سماوی (خداوندی) معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ قبول۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER.)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے؟ اس کا جواب کسی "مذہب پرست" شخص کی زبان سے نہیں، عصرِ حاضر کے بلند ترین سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنیئے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے:۔

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے موضوع سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ،

سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دُنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر۔ نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی سینے کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر یہ سائنس دان کہتا ہے:۔

وحی پر مبنی یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اُترتی ہیں اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

اور اسی پایہ کا ایک اور عالم طبیعیات ایڈنگٹن، اپنی کتاب (SCIENCE & THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:۔

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی مفکر اور مدبر، جمہوریت کے عواقب سے تنگ آکر، اب کس قسم کے نظام کے لئے مضطرب و بے تاب ہیں۔ اُس نظام کے لئے جس میں اطاعت کسی انسان کی نہ ہو۔ اطاعت صرف قوانین کی ہو! یہ قوانین کس قسم کے ہونے چاہئیں، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ لیکن چونکہ آگے بات اپنی قوانین کے حوالے سے چلتی ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر دہرا دیا جائے۔

۱- وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صحیح نظام حکومت وہی ہو سکتا ہے جس میں انسانوں کا اقتدار نہ ہو بلکہ قانون کی حکمرانی ہو۔

۲- یہ قانون ابدی، غیر متبدل، زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، عالم گیر ہو۔

۳- کسی حکومت کو اس کا اختیار نہ ہو کہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف، اس میں ترمیم بھی کر سکے۔

۴- یہ قانون خدا کا متعین کردہ ہو اور وحی کے ذریعے انسانوں کو ملا ہو۔

۵- اس کے اصول و حدود تو غیر متبدل ہوں لیکن اس کے نفاذ کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں۔

یہ ہے وہ نظام جس کا عکس یہ مفکر (سویڈن کے مشہور ماہر اقتصادیات۔ مرڈل کے الفاظ میں) "اپنی روح کے نشیمن میں دیکھ رہے ہیں"۔ اور جسے لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے ان کی نگاہیں بے تاب ہیں۔

(۰)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مفکر (کم و بیش سب کے سب) عیسائی ہیں اور وحی کے قائل۔ تو پھر انہیں انتظار اور تلاش کس بات کی ہے۔ یہ سیکولر ڈیماکریسی کی جگہ عیسائیت کا نظام کیوں نہیں رائج کر لیتے؟ اور اس کا جواب ایک فقرے میں یہ ہے کہ یہ عیسائیت کا نظام ہی تو تھا جس سے تنگ آکر انہوں نے سیکولر نظام رائج کیا تھا۔ عیسائیت (کلیسا) کی مخفیا کریسی نے انسانیت پر جس قدر لرزہ انگیز اور وحشت ناک مظالم ڈھائے تھے، ان سے بچنے کے لئے انہوں نے سیکولرازم کی پناہ تراشی تھی۔ اس لئے وہ عیسائیت کی طرف تو قیامت تک رخ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی انہیں معلوم ہے کہ موجودہ عیسائیت (بائیبل، خواہ وہ عیسائیوں کی انجیل

ہو اور خواہ یہودیوں کی تورات) مبنی بر وحی نہیں۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ اس مقالہ میں میرا موضوع مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہیں۔ لیکن عیسائیت کے متعلق ان مفکرین کی کیا رائے ہے، اس کی ایک جھلک دیکھ لینا غیر محل نہ ہوگا۔

عیسائیت کی ناکامی

پروفیسر جوڈ، لکھتا ہے:-

عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اُخروی دنیا خیرِ محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس، یہ دنیا شرّ و فساد کی دنیا ہے۔ اُس دنیا کی حیات ابدی ہے، یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے خیر اور طیّب نہیں۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS & POLITICS - P. 127)

ہسپانوی پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) اس باب میں کہتا ہے:-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی ذہانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے باہر کی چیز ہے..... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(QUOTED BY BRIFAULT - IN - THE MAKING OF HUMANITY - P. 334)

پروفیسر وائٹ ہیڈ کی رائے میں:-

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے، اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے، تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURE OF IDEAS - P. 18)

انہی حقائق کے پیشِ نظر، تہذیب کا مشہور امریکی مؤرخ، ڈورسی، اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے:-

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے، وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اعتماد نہیں۔ "اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے" یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۶)

(۶)

اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جائے، یا جس زندگی بخش نظام کی اسے تلاش ہے وہ کہیں سے مل سکتا ہے؟ وہ مل سکتا ہے اور ان پیمانوں پر پورا اترتا ہے (بلکہ ان سے بھی آگے جاتا ہے) جو ایسے نظام کے لئے ان مفکرین کے تصورات میں انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ میں نے اِس نظام کے سلسلہ میں ان مفکرین کی کتابوں کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اب میں ان کے لئے ایک ایسی کتاب کے

قرآنی نظام

اقتباسات پیش کروں گا جس میں یہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس کتاب کے متعلق خود مغرب کے اکثر محققین کا اعتراف ہے کہ وہ مبنی بر وحی ہے اور یکسر غیر محرف۔ اسے قرآن مجید کہا جاتا

ہے جو ہماری زندگی کے دائرے کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان مفکرین کے نزدیک بنیادی طور پر صحیح نظام وہ ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا انسانوں کا گروہ) محکوم نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي۔ (آیت کا باقی حصہ بعد میں آئے گا۔ ۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ——— خواہ اس کے پاس ضابطہ، قوانین ہو یا اقتدارِ حکمرانی حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو ——— کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔

آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے کس طرح چند الفاظ میں اس بنیادی مسئلہ کو حل کر دیا جس میں نوعِ انسان صدیوں سے مضطر کی طرح سرگرداں چلی آ رہی تھی۔ اس آیت میں، مقننہ اور انتظامیہ کے علاوہ نبی تک کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ اسے بھی حقِ حکومت حاصل نہیں!

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اصول یا قانون دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کی غرض و غایت اور حکمت کیا ہے۔ جب یہ کہا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں، تو اس کی وجہ یہ بتائی کہ

شرف و تکریمِ انسانیت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ اور تکریم و شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے نزدیک، انسانوں کی حکومت، شرف و تکریمِ انسانیت کے منافی ہے۔ ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز ماہر (ERICH FROMM) کہتا ہے کہ

ایسی سیاسی آزادی جس میں انسان کو سطحِ انسانیت سے گرا دیا جائے۔ جس میں اسے (DEHUMANISE) کر دیا جائے، آزادی نہیں رہتی۔ غلامی بن جاتی ہے۔

(THE REVOLUTION OF HOPE - P. 91.)

شرف و تکریمِ انسانیت یا احترامِ آدمیت تو خدا کا عطا کردہ ہے۔ قرآن کی رُو سے مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ، نہ صرف اس شرف و تکریم کی حفاظت کرے، بلکہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں شرف و تکریم کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور بڑھتی، پھولتی، پھلتی چلی جائیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت، جس سے اس کتابِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے، ربوبیتِ عالمین قرار دی ہے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۱/۱) ظاہر ہے کہ وہی نظام منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا ہوگا جو خدا کی اس صفت کا مظہر ہو۔ ایک فرام دوسرے مقام پر لکھتا ہے:-

زندگی کا تقاضا زندہ رہنا اور بڑھنا پھولنا ہے۔ اگر اس کے اس تقاضے کے راستے میں

رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس مسدود توانائی میں ایک تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کو نشوونما دینے کے بجائے اسے تباہ کر دینے کا موجب بن جاتی ہے۔ یاد رکھئے، تخریب یا تباہی (UNLIVED LIFE) ؎ کا فطری نتیجہ ہے۔ وہ افراد یا معاشرتی حالات جو زندگی کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں تخریب پیدا کرتے ہیں۔ اور تخریب وہ سرچشمہ ہے جس سے شر کے مختلف مظاہر پھوٹتے ہیں۔ (MAN FOR HIMSELF - P. 218)

(BARKER) جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، کہتا ہے:۔

وہی معاشرہ عدل کا علمبردار کہلا سکتا ہے جس کا مقصود یہ ہو کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ذات کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے (P. 123)

انسانوں کی حکمرانی میں، محکوموں کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے (انسانی حکومت قائم ہی خوف کے زور پر رہتی ہے) اور خوف، انسانی ذات کے تباہ اور اسے شرف و تکریم سے محروم کر دینے کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

خوف و حزن

اسلام، نظامِ فطرت میں کرب و اذیت، گناہ اور کش مکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلۂ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف و حزن سے آزاد ہو جائے ..... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلا دے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات، لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے ..... پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر برائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS & REFLECTIONS - P.P. 34-37)

؎ ان الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی غزل کا ایک شعر ہے جس کا تعلق تو رومانی جذبات سے ہے لیکن اس میں، عمر اور زندگی میں جو فرق کیا گیا ہے اس سے (UNLIVED LIFE) کے مفہوم کی خفیف سی جھلک سامنے آ جاتی ہے، اگرچہ ایرک فرام نے یہ الفاظ جس مفہوم کے لئے استعمال کئے ہیں وہ بہت بلند ہے۔ وہ شعر ہے ؎

جی لیا چار دن جوانی میں! زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

یعنی جس عمر میں "زندگی" نہیں ہوگی وہ (UNLIVED LIFE) ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جہنم کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (۲۰/۷۴) اس میں نہ زندگی ہوگی نہ موت۔ یہ وہ اندازِ زیست ہے، جسے (UNLIVED LIFE) کہا جائے گا۔

اسی حقیقت کو وہ "مثنوی اسرارِ خودی" میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است، اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ — ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا، پیراہنش — فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است !
شرک را در خوف مضمر دیدہ است (صفحہ ۱۱۰-۱۱۱)

"شرک" انسانوں کی حکمرانی کا نام ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے، خدا کی متعین کردہ حدود پر قائم شدہ نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) اس میں کسی کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا"۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے انسانوں کی حکومت کو مردود قرار دے دیا، تو اس سے کیا یہ مراد ہے کہ وہ انسانی دنیا کے لئے حکومت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بات یہ نہیں۔ وہ حکومت کو ضروری قرار دیتا

خدا کی حکومت

ہے لیکن "خدا کی حکومت" کو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "یاد رکھو! حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے"۔ وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶)۔

لیکن خدا تو غیر مرئی اور غیر محسوس ہستی ہے —— غیر مرئی اور غیر محسوس تو ایک طرف، اس کی ذات تو کسی کے تصور تک میں نہیں آسکتی۔ تو پھر اس کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہماری حکومت سے مراد، اس کتاب کی حکمرانی ہے جسے ہم نے وحی کے ذریعہ نازل کیا ہے۔ اس نے جملہ انبیاءِ کرامؑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ :-

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)

خدا نے ان انبیاء کے ساتھ الکتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کیا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کیا کریں۔

قانونِ خداوندی کی حکمرانی

شخصیت کے بجائے، قانون کی حکمرانی کا تصور، انسان کو کن بلندیوں پر لے جاتا ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! اور پھر قانون بھی وہ جو کسی انسان کا وضع کردہ نہ ہو۔ اسلام میں بلندترین اور عظیم ترین شخصیت حضور نبی اکرمؐ کی ہے۔ خدا نے حضورؐ کو بھی یہ حکم دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) "اے رسول! تم لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ سربراہِ مملکت، بالفاظ دیگر یوں کہیئے کہ رسول اللہؐ بھی اسی کتاب کا اتباع کرتے تھے۔ (۶/۵۰، ۱۰/۱۵) اور اس کی خلاف ورزی کو خود اپنے لئے بھی مستوجبِ سزا قرار دیتے تھے (۱۰/۱۵) حقِ مطلق۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) بھی اسی کتاب کو حاصل تھا۔ مملکت یا سربراہِ مملکت کو نہیں۔ (SOVEREIGN) کی تعریف یہ

کی جاتی ہے۔

(ACCOUNTABILITY TO NONE.)

جو کسی کے سامنے جواب دِہ نہ ہو، کوئی اس سے باز پُرس نہ کر سکے۔ قرآن مجید نے دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳)

صرف خدا کی ذات ایسی ہے جو کسی کے سامنے جواب دِہ نہیں۔ باقی سب جواب دِہ ہیں۔ اس سے کتاب اللہ کی حکمرانی کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔

اس کتاب میں دیئے گئے احکام و اصول و اقدار کے متعلق کہا کہ

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے کلمات (احکام و قوانین) صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

حتیٰ کہ رسول اللہؐ بھی نہیں۔ فرمایا:۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۔۔۔ (۱۰/۱۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ مجھے بھی اس کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کتاب میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں۔

اس کتاب کا اطلاق تمام قوموں پر، اور تمام زمانوں میں ہوگا۔ اس لئے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۷) کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ ہدایت۔

ان تصریحات کے بعد آیئے اس آیۂ جلیلہ کی طرف جو اس نظامِ خداوندی کی عروۃ الوثقیٰ ہے اور جس کا تھوڑا سا حصہ پہلے پیش کیا گیا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــــ خواہ اسے ضابطہ، قوانین، یا اقتدارِ حکومت، اور نبوت تک بھی کیوں نہ حاصل ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کی نہیں، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب، اس کتاب کی اطاعت سے، جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو، اور جس پر غور و فکر سے تم اس کے معانی کی تہ تک پہنچتے ہو، ربّانی بن جاؤ، یعنی خدا کے محکوم۔

اس آیت نے انسانوں کے حقِ حکومت پر یک قلم خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ جب اس نظام میں نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے، تو مذہبی پیشواؤں کو اس کا حق کیسے حاصل ہو جائے گا۔ ان کا تو اس نظام میں وجود تک نہیں ہوگا۔ ان کے متعلق

تھیاکریسی کا خاتمہ

قرآن کہتا ہے کہ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۹/۳۴) "وہ لوگوں کی محنت کی کمائی ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ اس طرح قرآن نے تھیاکریسی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

اور یہی ہے وہ کتاب جسے اس نے غلط اور صحیح نظام میں حدِ امتیاز قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اسلام، قرآنِ مجید کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا نام ہے۔ جو نظامِ حکومت اس کے مطابق نہیں، وہ کافرانہ نظام ہے۔

ہم پوچھتے ہیں مغربی مفکرین اور مدبرین سے کہ جس قسم کے نظام کی آپ کو تلاش ہے، کیا وہ اس کتابِ عظیم کے اندر نہیں ملتا؟ صحیح نظامِ انسانیت کے لئے جو پیمانے آپ نے مقرر کئے ہیں، کیا یہ ان پیمانوں پر پورا نہیں اترتا؟ اس نظام کو (کسی پر زبردستی مسلط کرنا تو ایک طرف۔ کیونکہ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا) ہم از خود آپ کے سامنے پیش بھی نہیں کر رہے۔ آپ اس کے متلاشی تھے۔ ہم نے صرف اس کا پتہ نشان بتا دیا ہے۔ آپ اس پر خود غور کر لیں۔ اگر یہ فی الواقعہ آپ کے ..... پیش کردہ پیمانوں پر پورا اُترے تو پھر اس کے اختیار کرنے میں تو آپ کو کسی قسم کا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے اقوامِ عالم اس جہنم سے نجات حاصل کر لے گی جس میں وہ اس وقت مبتلا ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اسے اس وقت قبول اور اختیار نہ بھی کیا تو اس سے اس کی ناکامی لازم نہیں آئے گی۔ نوعِ انسان نے بالآخر اس کی طرف آنا ہے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ... (۹/۳۳) اس نے آخر الامر ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے۔ نوعِ انسان اسے جتنی جلدی اختیار کر لے گی، مزید تباہیوں سے بچ جائے گی۔

(۰)

ثبات و تغیّر کا امتزاج

اب آیئے اس نظام کے اس گوشے کی طرف جس کے متعلق وہائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اسے ثبات اور تغیّر کا امتزاج ہونا چاہیئے۔ یعنی اپنی جگہ غیر متبدّل بھی اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے والا بھی۔

قرآنِ مجید کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں مختصر سے متعیّن احکام ہیں اور زندگی کے دیگر امور کے متعلق اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں اور اسے قرآنی مملکت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے طور طریقے، اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے۔ اس کے اصول اور اقدار تو ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان کی تعمیل کیلئے طور طریقے (جنہیں آپ جزئی قوانین یا "بائی لاز" کہہ لیجئے) حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ ثبات (غیر متبدّل) اور تغیّر (بدلنے والی جزئیات) کے

امتزاج سے یہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا جائے گا۔ جس نظام کو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہمیشہ تک نافذ العمل رہنا ہو اُسے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ یہ جزئی قوانین باہمی مشاورت سے وضع کئے جائیں گے۔ خود حضور نبی اکرمؐ سے ارشادِ خداوندی ہے، وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) امورِ مملکت میں ان (اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ اور اس طرح حضورؐ کے بعد، ملتِ اسلامیہ سے متعلق کہا کہ وَ أَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے"۔ ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے احکام، اصول و اقدار (کلمات اللہ) غیر متبدّل ہیں۔ لہٰذا ان میں، اُمّت تو ایک طرف، خود نبی اکرمؐ بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔ جن کلمات اللہ میں، کسی تبدیلی کی گنجائش یا امکان نہ ہو، ان میں کسی قسم کے مشورہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مشاورت، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت کے نظم و نسق کے بارے میں ہو گی۔ اس لئے اس کے لئے آمر کا لفظ آیا ہے۔ یعنی یہ مشاورت امورِ مملکت میں ہو گی۔ پھر اس مشاورت کا حکم بھی اصولی طور پر دیا گیا ہے۔ مشاورت کی مشینری اللہ تعالیٰ نے خود وضع اور متعین نہیں کی۔

ہر زمانے کی قرآنی مملکت جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے، اختیار کر سکے گی۔ تجربہ کے بعد، یا مرورِ زمانہ سے، اس مشینری میں ردّوبدل ہو سکے گا لیکن وہ حدود اپنی جگہ غیر متبدّل رہیں گے جن کے اندر رہتے ہوئے یہ مشاورت عمل میں آئے گی۔ یعنی اس مشاورت سے بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جا سکے گا جو کسی طرح بھی قرآنِ مجید کے احکام و اصول سے ٹکرائے۔ قرآنی مملکت کا اتنا ہی اختیار ہو گا۔ یعنی اس کا فریضہ قرآنی احکام و اصول کا نفاذ ہو گا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے طور طریق وضع کرنا، اس کے اختیارات کی حد۔ آپ اس کا مقابلہ مغربی جمہوریت سے کیجئے۔ اسلامی اور کافرانہ نظام نکھر کر سامنے آجائے گا۔ مغربی نظام جمہوریت ان بنیادوں پر قائم ہے کہ

جمہوریّت اور مشاورت

(۱) اقتدارِ اعلیٰ یا اختیارِ مطلق، قوم یا عوام کو حاصل ہے۔

(۲) قوم اس اختیار کو اپنے منتخب نمائندگان کو تفویض کر دیتی ہے۔

(۳) یہ نمائندگان یا ان کی اکثریت جس قسم کے قوانین چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ ان کے قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں۔ کوئی حدود و قیود نہیں۔ انہیں اس کا حقِ مطلق حاصل ہے ــــ قانون سازی کا یہی وہ حقِ مطلق ہے جس کے خلاف مغربی مفکرین صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

اس کے برعکس، قرآنی مشاورت میں قانون سازی کا حقِ مطلق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مشاورت یا جزئی قانون سازی، قرآن کی غیر متبدّل حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جا سکتی ہے۔ اس مملکت کی دستور اور قوانین ساز "اسمبلی" کوئی ایسا قانون نہیں مرتب کر سکتی جو قرآنی حدود سے ٹکرائے۔ مغربی مفکرین اسی قسم کے نظام کی تلاش میں ہیں۔

(۰)

اسلام کے صدرِ اوّل میں اسلامی نظام کا نقشہ یہی تھا۔ اس میں مشاورت کی مشینری کس قسم کی تھی اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ہماری تاریخ بالکلیہ قابلِ اعتماد نہیں۔ اس میں ہر قسم کے متضاد واقعات اور کوائف مل جاتے ہیں۔ اس میں ڈیٹو کی رُو سے فیصلوں کی مثالیں بھی مل جائیں گی اور کثرتِ رائے کی رو سے فیصلوں کی مثالیں بھی۔ اس باب میں میرا مسلک یہ ہے کہ اس میں جو واقعات ایسے ہوں جو قرآنِ کریم کی تعلیم اور پیغام کے مطابق ہوں، یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہوں، انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس مسلک کے مطابق، اس دور کے اندازِ مشاورت کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ جو ہمارے نزدیک منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ حجاز میں زرعی اراضی چنداں بڑے نہیں تھے اس لئے ان کے نظم و نسق کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق فتح ہوا تو وہاں بڑی وسیع و عریض اور نہایت زرخیز و شاداب اراضیات مملکت کی تحویل میں آئیں۔ اس وقت اس سوال نے پہلی مرتبہ ایسی اہمیت حاصل کی کہ یہ معاملہ مجلسِ مشاورت میں بحث کا موضوع بن گیا۔

صدرِ اوّل میں مشاورت

حضرت عمرؓ نے معاملہ زیرِ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رائے میں ان اراضیات کو افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے اور اس کا نظم و نسق علیٰ حالہٖ قائم رہنے دینا چاہیئے۔ بعض صحابہؓ نے اس تجویز کی مخالفت میں تقاریر کیں۔ معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، اس بحث کو دوسری نشست پر اٹھا رکھا جس میں انصار کے قبیلہ، اوس و خزرج کے عمائد کو بھی دعوت دی کیونکہ وہ اراضیات کے معاملہ میں بہتر تجربہ رکھتے تھے۔ اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے جو تقریر فرمائی وہ بڑی غور طلب ہے۔ آپؓ نے کہا:-

> میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری مدافعت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کسی نے میری مخالفت کی ہے۔ نہ اس پر فخر کہ کسی نے میری موافقت کی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ (اور حق کا معیار اللہ کی کتاب ہے)۔ یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے اپنے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔ (شاہکارِ رسالت۔ ص ۳۸۵)

آپ نے غور فرمایا کہ باہمی مشاورت کا مقصد کیا تھا؟ یہ مقصد کہ خدا کی کتاب پر غور و خوض کے بعد یہ طے کیا

جائے کہ اس باب میں اس کا منشا کیا ہے۔ اس نشست میں بھی معاملہ طے نہ ہوا تو آپ نے تین دن کی مزید مہلت چاہی تاکہ قرآن مجید پر زیادہ تعمق سے غور کر لیا جائے۔ تین دن کے بعد آپ نے مجلس سے کہا کہ میں نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کیا تو للہ الحمد کہ مجھے اس میں سے راہ نمائی مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ حشر کی آیات تلاوت فرمائیں اور کہا کہ ان میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (۵۹/۱۰)

ان میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئیں گے۔

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس قرآنی استدلال کو سن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور مخالفین اور موافقین سب جوشِ مسرت سے پکار اٹھے کہ "آپ کی تجویز بالکل درست ہے۔ ہم سب آپ سے متفق ہیں"۔

یہ تھا اندازِ مشاورت اسلام کے صدرِ اوّل میں۔ یعنی اس میں تحقیق یہ کیا جانا مقصود ہوتا تھا کہ معاملہ زیرِ نظر کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد یا منشا کیا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس مشاورت اور مغربی جمہوریت میں کس طرح "بعد المشرقین" ہے! وہ حضرات اپنی رائے اور وحی میں کس قدر فرق ملحوظ رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپؓ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے بہت بری بات کی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمّت کے لئے سنت نہ بناؤ"۔ ان آخری الفاظ میں اسلام میں قانون سازی کے اصول پر بڑی نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر (بفرضِ محال) ہمیں حتمی طور پر معلوم بھی ہو جائے کہ اُس زمانے میں کسی معاملہ کو کس طریق سے طے کیا گیا تھا، تو وہ طریقہ ابدی طور پر غیر متبدل دین نہیں قرار پا سکتا۔ وہ طریق اُس زمانے کے حالات کے مطابق، انہی کے لئے تھا۔ بعد کی اسلامی مملکت اپنے حالات کے مطابق اپنے لئے خود طریق وضع کر سکتی ہے، جو بات اس زمانے میں (یا کسی بعد کے زمانے میں) باہمی مشاورت سے طے پائی تھی وہ بہرحال انسانوں کی رائے تھی۔ اور (جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا) انسانی رائے ابدی طور پر دین نہیں بن سکتی۔

(۰)

یہ تھا قرآن کریم کی رو سے، اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت۔ اس سے ظاہر ہے کہ مغرب کا نظامِ جمہوریت اور اسلامی نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن غلامانہ ذہنیت بڑی پختہ اور غیر شعوری طور پر دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہے۔ غلاموں کو طبیعی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی ان کی ذہنیت غلامانہ ہی رہتی ہے اور اسے بدلنے میں بڑا وقت بھی لگتا ہے اور سخت محنت بھی درکار ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریت کی حمد و ستائش کے قصیدے ہمارے دورِ غلامی میں ہمارے کانوں میں پڑے۔ انگریز یہاں سے چلا بھی گیا لیکن یہ قصائد ابھی تک ہمارے دل کی گہرائیوں میں تہ نشین ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں "جمہوریت" کو عین مطابقِ اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۷۷ء میں تبدیلیٔ حکومت کے لئے جو تحریک اٹھی تھی اسے "بحالیٔ جمہوریت" کی اسلامی تحریک کہا جاتا تھا۔ اس تحریک کا مقصد شخصی حکومت کی جگہ قومی حکومت قائم کرنا تھا اور چونکہ قومی حکومت کے لئے مغرب میں جمہوریت کی اصطلاح رائج ہے اس لئے انہوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شخصی حکومت کے مقابلہ میں قومی حکومت قابلِ ترجیح ہوتی ہے لیکن ان میں سے ایک کو تو اسلامی اور دوسری کو اسلامی کہنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ شخصی حکومت اور مغربی انداز

ہم اور جمہوریت

کی جمہوری حکومت دونوں خلافِ اسلام ہیں۔ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو۔ اور کتاب اللہ کی حکمرانی اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں۔ لہٰذا، ان ممالک میں جہاں جمہوریت کا ذکر کیا جائے گا اس سے مراد شخصی حکومت کے برعکس، مغربی جمہوریت کے انداز کی حکومت ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، سیکولرازم (خلافِ اسلام نظام) کے نقطۂ نگاہ سے تو اس بحث کی گنجائش ہے کہ شخصی نظامِ حکومت اچھا ہے یا جمہوری انداز، لیکن قرآنی زاویۂ نگاہ سے اس بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے اس بحث کو بڑی عمدگی سے یہ کہہ کر نپٹا دیا کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور دین سے ان کی مراد قرآن ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

---

(۰)

چونکہ پاکستان اسلام کے نام سے حاصل کیا گیا تھا، اس لئے ہمارے ہاں یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ کوئی بات کی جائے اس کے ساتھ لفظ اسلام کا تکملہ ضرور لگا لیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے جب یہاں معاشی نظام کی بات چلی تھی تو سوشلزم کے حامیوں کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ یہ نظام اسلام کے خلاف ہے۔ انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ ہم یہاں سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک سوشلزم کے ساتھ لفظ اسلامی کے الحاق سے لادینی سوشلزم عین اسلامی ہو گیا۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی میں کچھ ہنگامے ہوئے جن میں تخریب پسندوں نے لوٹ مچائی۔ عمارات پر پتھراؤ کیا۔ دکانوں کو جلایا۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر دکانداروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں۔ وہاں ایک بند دکان کے کواڑ کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا "یہ شراب کی اسلامی دکان ہے۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے"۔ ہمارے ہاں اس طرح ہر غیر اسلامی بات اسلامی ہو جاتی ہے۔ یہی صورت اسلامی جمہوریت کی ہے۔ واضح رہے کہ جب کوئی لفظ بطور اصطلاح کے رائج ہو جائے تو اس کے لغوی معانی نہیں بلکہ اصطلاحی معانی لئے جاتے ہیں۔ سوشلزم کی طرح جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد مغرب کا سیکولر جمہوری نظام ہے۔ اس اعتبار سے "جمہوریت" اور "اسلامی" دو متضاد عناصر ہیں جو آپس میں مل نہیں سکتے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس اصطلاح کو ہمارے ہاں شخصی نظامِ حکومت سے متمیز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے خالی "جمہوریت" یا "جمہوری نظام" کہئے۔ "اسلامی" کا الحاق تو اس کے ساتھ نہ لگائیے۔ اس لئے کہ کسی نظام کے اسلامی ہونے کی شرط پہلے بیان ہو چکی ہے۔ یعنی اگر اس نظام میں کتاب اللہ کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، حکمرانی اس کی ہے، تو وہ اسلامی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ اسلامی نہیں خواہ وہ شخصی ہو اور خواہ جمہوری۔ (کئی اور مملکتوں کی طرح) ہمارے آئین میں بھی پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کہا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ قرآنی اصول کے مطابق یہ مملکت ابھی تک اسلامی نہیں بنی، اس میں جب کبھی جمہوری نظام رائج ہوا ہے اس کی جزئیات تک بھی مغربی جمہوریت سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس میں اس پر تو بحث ہوتی ہے کہ سسٹم پارلیمانی ہونا چاہئے یا صدارتی۔ یہ سوال کبھی زیرِ بحث نہیں آتا کہ اسے "اسلامی" کس طرح بنایا جائے۔ گویا اس طرف سے قوم بالکل مطمئن ہے کہ چونکہ اس کا نام اسلامی جمہوریہ ہے اس لئے یہ مملکت اسلامی ہے۔

الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا ہے اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ تھیاکریسی (THEOCRACY) کے لغوی معنی ہیں "خدا کی حکومت" لیکن اصطلاح میں یہ مذہبی پیشواؤں کی حکومت کو کہا جاتا ہے جس میں ہر غیر خدائی حربہ خدا

کے نام پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈیماکریسی (DEMOCRACY) کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی یکساں ہیں۔ یعنی عوام کی حکومت۔ یہ لغوی اور اصطلاحی ہر دو لحاظ سے اسلام کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں ایک آواز اٹھی تھی کہ "اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں"۔ تو مذہبی حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا تھا۔ ان کے نزدیک یہ آواز تو خلافِ اسلام تھی لیکن جمہوریت عین مطابقِ اسلام تھی۔ یعنی انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خود جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں یا حقِ حکومت عوام کو حاصل ہے۔

بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے جمہوریت کی مخالفت ہوتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ان کے نزدیک یہ نظام قرآن کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ صدرِ اوّل کے بعد ہمارے ہاں ملوکیت مسلط ہوگئی جو آج تک چلی آرہی ہے۔ ملوکیت کے خلافِ قرآن ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ قرآن تو اس کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ بقولِ اقبالؒ:-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است　　　نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم!　　　کہ در دینش ملوکیت حرام است　(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۴)

ہمارے ہاں کی تاریخ۔ روایات۔ فقہ سب دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئے۔ انہی کے مجموعے کا نام (مروّجہ) اسلام ہے۔ ان کے مرتب کرنے والے بڑے واجب الاحترام مقتدا ہیں۔ لیکن (جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے) ہمیں کہیں یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ان میں سے کسی نے ان بادشاہوں سے کہا ہو کہ تمہاری حکومت اصلاً خلافِ اسلام ہے۔ عقائد اور مسالک کے اختلاف کی بنا پر ان بزرگوں میں سے بعض نے ان سلاطین کے ہاتھوں صعوبات بھی برداشت کیں، لیکن اصل و بنیادِ ملوکیت کو خلافِ اسلام قرار دینے کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی۔

اس کے برعکس محراب و منبر سے ان کے حق میں تعریف و تحسین کے کلمات اور خطبوں میں ان کی مملکت کے استحکام و فروغ کی دعاؤں کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ اب اگر ہمارے مذہبی پیشوا شخصی حکومت کی مخالفت کریں تو ان سے پہلا سوال یہ پوچھا جائے گا کہ پھر آپ ان اسلاف کے متعلق کیا کہیں گے جنہوں نے ملوکیت کے خلافِ اسلام ہونے کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس کے برعکس الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے: اتوہ اربعین شیخاً فشہدوا لہ ان الخلفاء لاحساب علیہم ولاعذاب۔ "چالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ خلفاء قیامت کے دن بلاحساب بخشے جائیں گے۔ ان پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ (تاریخ الیافعی صفحہ ۲۳۲ - بحوالہ طلوع اسلام - جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۴۲)۔ فقہ حنفی کے مشہور امام جصاص نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "محدثین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کا خیال تھا کہ ظلم و جور اور بےگناہوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ہاں بادشاہوں کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے۔ اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو بہرحال کسی کے خلاف اٹھانا شرعاً جائز نہیں۔ (احکام القرآن جلد دوم صفحہ ۳۲ - بحوالہ ایضاً)۔ فقہ حنفی البتہ اس باب میں اتنی سی رعایت برتتی ہے کہ

کل شیء صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحد علیہ الا القصاص　(ہدایہ اوّلین۔ مجیدی صفحہ ۴۹۳)

ایسا امیر جس کے اوپر کوئی دوسرا امیر نہ ہو، قتل کے سوا کوئی جرم بھی کرے، تو اس پر حد نہیں۔

جن حضرات کے عقائد اس قسم کے ہوں وہ شخصی حکومت کو کس طرح خلافِ اسلام قرار دے دیں گے؟ یوں بھی مذہبی پیشوائیت پنپتی ہی شخصی حکومت میں ہے۔ وہ انہیں فقہی قوانین کی ترویج کی اجازت دے دیتے ہیں اور یہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلام کا منشا پورا ہو گیا خواہ اسلوبِ حکومت کسی قسم کا ہو۔

۱۔ ان حقائق کو مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب "حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی" صفحہ ۳۵ - شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

[illegible]

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ جمہوریت کو مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں نہ وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے اور نہ ہی وہ جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے مملکت نہ کسی ایک شخص کی ملکیت ہو سکتی ہے نہ کسی گروہ کی۔ وہ پوری کی پوری اُمت کو عطا ہوتی ہے۔ آیۂ استخلاف میں ہے، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ..... (۲۴/۵۵) "جو لوگ تم میں سے ایمان اور اعمالِ صالحہ پر کاربند ہوں گے ان سے خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں ملک میں حکومت عطا کرے گا"۔ سورۂ حج میں انہی مومنین کے متعلق ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۲/۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گا تو ......" اس سے واضح ہے کہ مملکت اور حکومت پوری کی پوری اُمت کو عطا ہوتی ہے۔ یہ رہی ایک بات۔ اور دوسری بات یہ کہ مملکت یا حکومت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ آیۂ استخلاف میں ہے، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵) یہ اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ دینِ خداوندی کو متمکن کریں۔ اور سورۂ حج میں کہا گیا ہے کہ یہ اقتدار اس لئے دیا جاتا ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱) وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر، مملکت کا نظم و نسق پوری اُمت کا فریضہ ہو گا جسے وہ باہمی مشاورت سے سرانجام دیں گے لیکن اس کا مقصد دین کا تمکن ہو گا، جو کتاب اللہ کی حکمرانی سے حاصل ہو سکے گا۔

———— (۰) ————

چونکہ یہ موضوع ذرا پیچیدہ سا ہے اور بحث قدرے طویل ہو گئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ملخص چند الفاظ میں بیان کر دیا جائے:۔

(۱) دانشورانِ مغرب نے شخصی حکومتوں اور تھیاکریسی سے تنگ آ کر ایک نئے نظامِ حکومت کی طرح ڈالی جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) اس نظام کی رو سے انہوں نے کہا کہ (i) اقتدارِ اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ (ii) قوم اپنے اس اقتدار کو اپنے منتخب نمائندوں کو تفویض کر دیتی ہے۔ اور (iii) یہ نمائندے بالاتفاق یا کثرتِ رائے سے جس قسم کا قانون چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ انہیں قانون سازی کا حقِ مطلق حاصل ہوتا ہے اور ان قوانین کی اطاعت تمام قوم پر لازم۔

(۳) مفکرینِ مغرب نے سمجھا تھا کہ اس سے وہ انسانوں کی حکومت سے نجات حاصل کر لیں گے لیکن تھوڑے سے عرصہ کے تجربہ نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ نظام شخصی حکومتوں سے بھی زیادہ مستبد اور انسانیت کش ہے۔

(۴) اس بنا پر اب وہ کسی اور نظام کی تلاش میں ہیں۔ اس نظام کا ان کے ذہن میں تصور یہ ہے کہ

(ا) اس میں حکمرانی انسانوں کے بجائے خدا کی ہونی چاہیئے۔

(ب) اس سے مراد تھیاکریسی نہیں، بلکہ خدا کے عطا کردہ ابدی، غیر متبدّل، عالمگیر قوانین ہیں جن کا اطلاق تمام اقوامِ عالم پر، ہر زمانے میں یکساں ہو سکے۔

(ج) یہ قوانین تو ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کی مشینری کی ضرورت پڑے گی۔

(د) یہ قوانین، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی مل سکتے ہیں۔

(۵) اس نظام کے بنیادی اصول تو انہوں نے ذہن میں قائم کر لئے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا... کہ یہ قوانین انہیں ملیں گے کہاں سے؟ وہ (کم و بیش) سب کے سب علماء ئیت کے سپرد ہیں لیکن انہوں نے عبا ثبت کو اس مقصد کے لئے بالکل ناکام پایا۔

ظاہر ہے کہ ان کے معیار کے مطابق قوانینِ قرآن کریم میں مل سکیں گے لیکن ان کی نگاہ اس طرف سے اس لئے نہیں اُٹھ رہی کہ اُن کے نزدیک اس قرآن کی حامل قوم مسلمانوں کی ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پست اور کمزور ہے۔ اور اُن کے ہاں یا تو شخصی حکومتیں قائم ہیں یا اس جمہوری انداز کی جسے وہ عملی تجربہ کے بعد مردود قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اور قرآن کے درمیان یہ حائل ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ان اقوام کی متجسس نگاہوں سے اندازہ لگالیا تھا کہ دنیا کو کس نظام کی تلاش ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی انہیں اس نظام کی جھلک دکھائی نہیں دے گی۔ اس نظام کو کسی نئے خطۂ زمین میں قائم کر کے، دنیا کو دعوت دینی چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کا مشاہدہ کرلیں۔ اس کے لئے انہوں نے کہا تھا کہ

کر سکے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　　میری نگاہ نہیں سوئے بصرہ و بغداد

اس قسم کی تازہ بستی آباد کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ ان کا مقصد اس میں قرآنی نظام کا قیام تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ اس دعوت کی سخت مخالفت ہوگی اس لئے اسے قائم کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوگی۔ اسے وہی قائم کر سکے گا جو عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے گا۔

وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند خلیفہ ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ــــ حسبنا کتاب اللہ ــــ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

پاکستان میں نظامِ حکومت کے متعلق یہی تصور قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے اصول ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول، اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (حیدرآباد دکن کا انٹرویو)

پاکستان میں اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اس نظام نے بالآخر قائم ہو کر رہنا ہے۔ اس کا قیام جس کسی کے بھی مقدر میں ہوا، اسے اس کے لئے نیا نام رکھنا ہوگا۔ وہ نہ ملوکیت ہوگی نہ آمریت۔ نہ تھیاکریسی ہوگی نہ ڈیماکریسی۔ چونکہ اس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی، اس لئے وہ اپنے مفہوم اور مقصود کے اعتبار سے (QURAN-O-CRACY) ہوگی ــــ یعنی مملکتِ قرآنیہ۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ اس پر شخصی تسلط نہ ہو سکے، اسے "مملکتِ قرآنیہ" کہا جا سکے گا۔ یعنی وہ مملکت جس کا نظم و نسق ملت کے ذمہ ہو لیکن جس پر حکمرانی باقتدارِ اعلیٰ 'کتاب اللہ' (قرآنِ مجید) کا ہو۔ یہی وہ نظام ہے جس کی دنیا کو تلاش ہے۔ اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا کیونکہ (اگرچہ یہ درحقیقت اسلامی ہوگی لیکن) ہمارے مذہبی فرقوں کے اختلافات کی وجہ سے "اسلام" کا کوئی متفق علیہ متعین مفہوم ہی نہیں رہا۔ ہر فرقہ (بلکہ اب تو ہر شخص) کا اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ قرآن کوئی نظریہ یا تصور نہیں۔ وہ ایک محسوس اور مرئی کتاب ہے جس کے منزل من اللہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اس لئے اس مملکت کو اسلامی کے بجائے قرآنی کہنا ہوگا۔ خود خدا نے بھی: وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) کہا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اسلام وہ الدین (نظامِ حیات) ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہے۔ اس سے مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔

ــــــ (○) ــــــ

[illegible]